فضائل قرآنی

(۴)

مزید فضائلِ قرآنی یوں بیان فرمائے کہ: وھو الذی لا تزیغ بہ الاھواء ولا تلتبس بہ الالسنۃ یعنی یہی تو وہ کتاب ہے جس سے نہ خواہشوں میں کجی آتی ہے اور نہ زبان میں لغزش۔

قرآن زیغ ہی تو دور کرنے کو آیا ہے۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ اس کے ذریعے زیغ اور کجی پیدا ہو؟ انسانی اہواء (خواہشیں) خود غرضی اور مفاد پرستی کی طرف لے جاتی ہیں اور مختلف انسانوں کی خواہشوں میں یقیناً ٹکراؤ اور تناقض پیدا ہوتا ہے اور انسان ہمیشہ اپنی خواہشوں پر چلنا چاہتا ہے جس کے نتیجے میں باہمی تصادم اور فساد فی الارض ظہور پذیر ہوتا ہے۔ یہ خواہشیں انسان کو کہاں کہاں لے جاتی ہیں اس کا اندازہ تو صرف ایک آیت سے ہو سکتا ہے کہ: اس ایت من اتخذ الٰھہ ھواہ (کیا تم نے اسے بھی دیکھا ہے جس نے اپنی خواہشوں کو معبود بنا رکھا ہے؟) گویا خواہش انسان کو کفر و شرک تک بھی پہنچا دیتی ہے۔ اس کجی سے بچنے کی ایک ہی شکل ہے اور وہ یہ ہے کہ اپنی خواہشوں کو خدا کی مرضی میں مدغم کر دیا جائے۔ خدا کی خواہش میں اپنی خواہشوں کو گم کر دیا جائے۔ خدا کی مرضی قرآن ہے پس جو قرآن کے پیچھے چلے گا اس میں کجی نہیں آسکتی کیونکہ کجی تو اپنی خواہشوں کے پیچھے چلنے سے پیدا ہوتی ہے جب یہ کجی دور ہو جائے گی تو لازماً انسان ایک سیدھی راہ ہی پر چلنے لگے گا اور بات بھی کرے گا تو زبان سے سیدھی بات نکلے گی کیونکہ قرآن کا حکم بھی یہی ہے کہ: قولوا قولاً سدیدا۔ کجی تلی سیدھی بات کرو۔ جب قرآن کے پیچھے چلنے سے اندرونی میلان و رجحان اور زاویۂ نظر میں راستی پیدا ہوگی تو زبان بھی راست ہوگی۔ اس میں کوئی التباس، کجی اور گڈ مڈ نہیں ہوگا۔ التباس تو وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں دل میں منافقت ہو اور "لبس الحق بالباطل" کی کوشش ہو۔ جب قرآن کے پیچھے چلنا ہو اور ظاہر ہے کہ قرآن سراسر حق ہے تو التباس کیسے پیدا ہوگا؟ یہی وہ مضمون ہے جسے اگلے فقرے میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ ولا تلتبس بہ الالسنۃ اس سے زبان میں التباس کی لغزش نہیں آتی۔

آگے ارشاد ہوتا ہے کہ ولا تشبع منہ العلماء۔ اہل علم اس سے سیر نہیں ہوتے۔ یہ ایک ایسی واضح

حقیقت ہے جس پر آج تیرہ صدیوں کی تاریخ گواہ ہے۔ سینکڑوں تفسیریں لکھی گئیں۔ بے شمار گوشوں پر بحثیں ہوئیں لیکن کیا آج تک کوئی یہ کہہ سکا کہ قرآن سے ہم سیر ہو چکے؟ جتنا غور و فکر کیجئے اسی قدر نئے نئے معارف اور حقائق اور جدید سے جدید نکات زندگی کے راز کھلتے جاتے ہیں۔ اور ہر مفکر ـــــ عام اس سے کہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم ـــــ اسی نتیجے پر پہنچتا ہے کہ ابھی ہم اس بحرِ ناپیداکنار کے کنارے ہی کھڑے ہیں۔ معلوم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد۔

پھر ارشاد ہوتا ہے کہ ولا یخلق علی کثرۃ الرد۔ بار بار دہرانے سے اس میں کوئی کہنگی نہیں آتی۔ یہ تو ظاہر ہے کہ قرآن سمجھنے کے لیے آیا ہے تاہم اس کی کشش کا یہ عالم ہے کہ کروڑوں انسان ایسے ہیں جو بے غور و فکر روزانہ تلاوت کرتے ہیں۔ وہ اگرچہ اس کا صحیح فائدہ حاصل نہیں کرتے لیکن سینکڑوں ختم کر جانے کے بعد کہنگی انہیں بھی محسوس نہیں ہوتی۔ ہر دور اُن کے لیے پہلے دور کی طرح تازہ اور جدید ہوتا ہے۔ اس سے اندازہ کر لیجئے جو غور و فکر کے ساتھ تلاوت کرتے ہیں (یتلونہ حق تلاوتہ) وہ ہر بار اس کلام الٰہی میں کتنی تازگی اور کیسی زندگی پاتے ہوں گے۔ اخبار، ناول، تاریخ، ادب اور دوسرے علوم و فنون کی کتابیں ایک دو بار پڑھی جاتی ہیں اور رکھ دی جاتی ہیں۔ لغت کی کتاب کوئی بھی شروع سے آخر تک نہیں پڑھتا۔ آسمانی کتابوں کو پوری زندگی میں دو چار بار ختم کرنے والے بھی مشکل سے ملیں گے۔ لیکن قرآن پاک کی پڑھائی کا یہ عالم ہے کہ برٹانیکا انسائیکلوپیڈیا کے مصنفین کو بھی یہ اعتراف کرنا پڑا ہے کہ:

THE MOST READABLE BOOK IN THE WORLD (قرآن دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب ہے)۔ کتنی بڑی حقیقت حضور نے بتائی ہے کہ بار بار پڑھنے سے بھی اس میں کہنگی محسوس نہیں ہوتی۔ اس کی تعلیمات ایسی ہیں یا دو ہر دور میں اس کے احکام مسائل زندگی کا ایسا لاجواب حل پیش کرتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کلام آج ہی نازل ہوا ہے۔ گویا ہر بار یہ کلام تازہ ہی رہتا ہے:

چوں کہن گردد جہانِ در برش　　　می دہد قرآں جہانِ دیگرش

اگر اس میں کہنگی محسوس ہو تو کون ہے جو اسے بار بار پڑھنے کا دردِ سر مول لے؟ اس کی تازگی اور نو تازگی ہی تو ہے جو مزید غور در غور اور فکر در فکر پر مجبور کر دیتی ہے:

چہ حسن ست ایں کہ گر ہر دم رخت را صد نظر بینم　　　ہنوزم آرزو باشد کہ یکبار دگر بینم

آگے ارشاد ہوا کہ ولا تنقضی عجائبہ۔ اس کے عجائب کبھی ختم نہیں ہوتے۔ یہ حقیقت بھی کسی دلیل کی محتاج نہیں۔ اگر اس کے عجائب کسی دور میں بھی ختم ہو جاتے تو اسے وہیں رکھ دیا جاتا اور اسے مزید توجہ کے قابل ہی نہ سمجھا جاتا۔ ہر چیز پرانی ہو جاتی ہے لیکن قرآن وہ کتاب ہے جو بار بار کی تکرار کے باوجود بھی تازہ ہی رہتی ہے۔

اس کے بعد ارشاد ہے کہ وھو الذی لم تنتہ الجن اذا سمعتہ حتی قالوا " انا سمعنا قرآنا عجبا یھدی الی الرشد فآمنا بہ"۔ یعنی یہی وہ کلام ہے جس کو سن کر جن بھی اس کی انتہا کو نہ پا سکے اور اسے سن کر انہیں کہنا پڑا کہ: ہم نے تو ایک ایسا عجیب کلام سنا ہے جو رشد کی طرف لے جاتا ہے اور ہم تو اس پر ایمان لے آئے"۔ یہاں جنوں کی حقیقت پر بحث مقصود نہیں۔ بہر حال قوم جن ایمان لائی اور اس کا قولِ مذکور قرآن میں سورۂ جن کے اندر موجود ہے۔

پھر ارشاد ہوا من قال بہ صدق ومن عمل بہ اجر ومن حکم بہ عدل ومن دعا الیہ ھدی الی صراط مستقیم۔ جس کا قول قرآن کے مطابق ہوگا وہ سچا ہوگا اور جو اس پر عمل کرے گا وہ مستحق اجر ہوگا اور اس کے مطابق فیصلہ کرے گا وہ عادل ہوگا اور جو اس کی طرف دعوت دے گا وہ صراطِ مستقیم پائے گا۔ اوپر کے تمام ارشادات کا خلاصہ ان چند جملوں میں آگیا ہے اور سچ پوچھئے تو قرآنی فضائل کا سارا سمندر اس کوزے میں سمو دیا گیا ہے۔ قرآن خدا کا کلام یا قول ہے اور قول الٰہی کے متعلق خود کلام الٰہی کی شہادت یوں ہے کہ ومن اصدق من اللہ قیلا ـــــ ومن اصدق من اللہ حدیثا۔ خدا سے زیادہ کس کی بات سچی ہو سکتی ہے؟ تمام صداقتیں قرآن پاک کے اندر موجود ہیں لہٰذا جس کی زبان سے کوئی ایسی بات نکلے جو قرآن کے مطابق ہو تو ظاہر ہے کہ وہ سچی حقیقت ہوگی اور ناقابل تردید صداقت ہوگی۔ اسی کو یوں کہا گیا ہے کہ من قال بہ صدقا۔ پھر یہ حقیقت ہے کہ قرآن کریم انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لیے ایسے اصول دیتا ہے جو زندگی کو دنیا اور آخرت دونوں میں بامراد، کامیاب اور بارآور بناتے ہیں۔ اجر کا مفہوم صرف آخرت کا ثواب نہیں۔ اجر کا تعلق دنیا و آخرت دونوں ہی کی فلاح سے ہے کیونکہ دنیوی زندگی اخروی زندگی ہی کا ایک حصہ ہے۔ اجر و ثواب ـــــ خواہ اچھا ہو یا بُرا دونوں ہی کا اثر پہلے دنیا میں ظاہر ہونا چاہیئے۔ جس اجر و ثواب کا آغاز دنیا میں نہ ہو اس کے متعلق سمجھ لینا چاہیئے کہ آخرت میں بھی اس کا کوئی نتیجہ ظاہر نہ ہوگا۔ دنیا تو آخرت کی کھیتی ہے (الدنیا مزرعۃ الآخرۃ) لہٰذا کھیتی کے کچھ نہ کچھ آثار دنیا میں ظاہر ہونے چاہئیں۔ اسی مفہوم کو یوں ظاہر کیا گیا ہے کہ من عمل بہ اجر ـــــ جو اس پر عمل کرے گا وہ (دونوں جہان میں) اجر پائے گا۔

قرآن سراپا عدل بھی ہے۔ نہ خدا ظلم کرتا ہے نہ اس کے کلام میں کوئی ظلم ہے۔ جو کچھ بھی قرآن پاک میں ہے وہ عین عدل ہے اور اس کی ساری تعلیمات عدل و اعتدال ہی پیدا کرنے کے لیے ہیں۔ لہٰذا جو شخص بھی اپنے فیصلے کی بنیاد قرآن پر رکھے گا وہ عادلانہ ہی ہوگا۔ غیر عادلانہ تو اس وقت ہوتا ہے جب اس کی اساس قرآن کی بجائے کسی اور شے پر ہو۔ قرآن خدا کا تشریعی قانون ہے اور کائنات کی بقا جس طرح خدا کے تکوینی قانونِ توازن پر

موقوف ہے اسی طرح انسانی معاشرے کی بقا بھی اس کے تشریعی قوانینِ عدل پر منحصر ہے۔ قوانینِ تکوین سے سرِ مو انحراف بھی موجبِ فساد ہوتا ہے اور معاشرۂ انسانی کا بھی یہی حال ہے۔ جہاں بھی فساد ہے اس کا سبب تشریعی قوانین سے انحراف ہے۔ امن و صلاح صرف قانونِ خداوندی ہی سے قائم رہ سکتا ہے۔ کائنات میں قانونِ تکوینی سے اور معاشرۂ انسانی میں قانونِ تشریعی سے۔ اسی مضمون کو حضورؐ نے یوں بیان فرمایا ہے کہ من حکم بہ عدل۔ جو قرآن کے مطابق فیصلے کرے گا وہ مطابق عدل ہوگا۔ یہاں فیصلے کے مفہوم میں تمام طرح کے فیصلے داخل ہیں۔ خواہ وہ انفرادی ہوں یا اجتماعی۔ اپنی ذات سے تعلق رکھتے ہوں یا دوسروں سے۔ اپنی قوم کے بارے میں ہوں یا غیر قوم کے بارے میں۔ جنگ سے متعلق ہوں یا صلح سے۔ غرض زندگی کے ہر موڑ کے لیے قرآن پاک نے ہدایات دیدی ہیں۔ ان کو پیشِ نظر رکھ کر جب فیصلہ کیا جائے گا تو لازماً وہ عادلانہ ہی ہوگا۔ اور جو فیصلہ عادلانہ ہوگا وہی امن کا ضامن بھی ہوگا۔

آخری بات جو گویا اس پوری حدیث کا نچوڑ ہے حضورؐ نے یوں فرمائی کہ ومن دعا الیہ ھدی الی صراط مستقیم۔ جو قرآن کی طرف دعوت دے گا وہ صراط مستقیم کی طرف ہدایت پائے گا یا وہ صراط مستقیم کی طرف راہنمائی کرے گا۔ دونوں معنی صحیح ہیں۔ اسی حدیث میں ایک جگہ فرمایا گیا ہے کہ وھو الصراط المستقیم۔ صراط مستقیم یہی قرآن ہے۔ اس کی مختصر تشریح ہو چکی ہے۔ اس لیے کچھ مزید لکھنے کی ضرورت نہیں۔ ظاہر ہے کہ جب قرآن ہی صراطِ مستقیم ہے تو جو شخص بھی قرآن کی طرف دعوت دے گا اس کی دعوت صراط مستقیم ہی کی طرف ہوگی۔

ہاں یہاں ایک حقیقت کو خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ ہر مسلمان ہر نماز کی ہر رکعت میں اھدنا الصراط المستقیم کہہ کر خدا سے صراط مستقیم پر چلائے جانے کی دعا کرتا ہے۔ یہ محض سرسری سی دعا نہیں بلکہ فطرت انسانی کی پکار ہے۔ ہر انسان کی فطرت، ہر معاملے میں دراصل صراط مستقیم ہی چاہتی ہے۔ صراطِ مستقیم راہِ اعتدال یا نقطۂ اعتدال کا نام ہے جو ہر قدم پر مطلوبِ انسانی ہوتا ہے۔ ہر شخص نمک میں اعتدال چاہتا ہے۔ نہ وہ اتنا زیادہ نمک پسند کرتا ہے جو کڑوا ہو جائے نہ اتنا کم پسند کرتا ہے جو پھیکا معلوم ہو۔ جب اس فطرتِ سلیمہ کے مطالبے کو انسان نظر انداز کر کے ہوس کا شکار ہوتا ہے تو نقصان اٹھاتا ہے۔ فطرتِ سلیمہ چاہتی ہے کہ معتدل مقدار میں کھانا ہو لیکن جب ہوس ناک حد سے زیادہ کھا جاتا ہے تو نقصان بھی اٹھاتا ہے۔ اگر کسی وجہ سے وہ ضرورت سے کم کھاتا ہے جب بھی نقصان پہنچتا ہے۔ اسی غلط روی سے بچنے کے لیے خدا سے صراطِ مستقیم کی توفیق مانگی جاتی ہے۔ یعنی ہمیں اس راستے پر چلا جو فطرتِ سلیمہ کی پکار ہے۔ اور اس راستے پر نہ چلا جس کی طرف فطرتِ سقیمہ لے جاتی ہے۔

(محمد جعفر)